پروین شاکر

خوشبو شائع ہوئی تو چند "مردِ دانا" نے پروین شاکر کو اردو شاعری کا اختر شیرانی کہا اور یوں کیکر پر انگور چڑھا کر لطفِ لذتِ مردانگی اپنے لیے مختص کیا۔

ساری دنیا میں عورت کی شاعری کو ایک محدود طبقے اور درجے کی شاعری سمجھ کر دوسرے درجے کے شہری کی دوسرے درجے کی شاعری جاننا ایک عوامی رویّہ رہا ہے، مگر سیفو، اینا اکھماتوف، سلویا پلاتھ، لی چنگ چاؤ، میرابائی، ایڈرن رچ، فروغ فرخ زاد اور ایریکا ژون کی شاعری نے، شعری افق پر اسلوب اور اظہارِ فن کو فوقیت دی۔ برِصغیر میں امرتا پریتم، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر نے شاعری سے ماورائیت کو خارج کرکے، اپنے انداز میں اپنی بات کہنے کا حوصلہ اردو شاعری کو دیا ہے۔

پروین شاکر نے دہرائے ہوئے جذبوں کو دہرا کر شاعری نہیں کی۔ اس نے رو کر، التجا کرکے اپنی مشرقیت کی لاج رکھنے کا ہنر بھی نہیں آزمایا۔ پروین شاکر نے تو ایک فرد کو معاشرے کی تہذیب یافتگی کے باوجود، وحشیانہ سزاؤں کی تپتی ریت پر پابرہنہ چلنے پر مجبور ہوتے دیکھا ہے، مگر جذبۂ عشق سلامت رکھتے ہوئے، اپنے حوصلے کی قندیل فروزاں کیے، نہ وہ دھجی دھجی جمع کرتی ہے، نہ مجرموں کو احساسِ جرم کے کچوکے دیتی ہے بلکہ یوں اشارے کرتی ہے کہ "جیہڑے بہتیاں تراں، او ہوئی وڈّے گراں"

اردو شاعری کے گزشتہ اور آنے والے دس سال بھی، شاعرات اور خصوصاً پروین کے عطا کردہ اسلوب کے آئینہ دار ہوں گے۔

کشور ناہید

صد برگ

پروین شاکر

ایک ہزار

۱۹۸۸ء

پروڈکشن : مطرب صحرائی

بشکریے : غالب پبلشرز، لاہور

طباعت : روشنی پرنٹنگ پریس آفسیٹ ورکس برہم پوری دہلی

پروسیسنگ : ایس، آر، آفسیٹ پروسیس نئی سڑک دہلی

طباعت سرورق : نیو کریسنٹ پرنٹرز دہلی

جلد ساز : یونیورسل بک بائنڈنگ کمپنی دہلی

ناشر : شانِ ہند پبلی کیشنز

فلیٹ ۸ء انصاری مارکیٹ

دریا گنج، نئی دہلی ۲

امی کے نام

لیجیے، اب پتہ چلا، خوشبو جب اپنے بدن میں ڈھلتی ہے، تو صد برگ بنتی ہے — پروین نے اپنے سفر کے ان دو مرحلوں کے درمیان جو مسافت طے کی ہے، دُنیائے شعر میں اس سے پہلے اس کا سُراغ نہیں مِلتا۔ یہ وہ راہیں ہیں، جنہیں پروین کو خود تراشنا پڑا۔ نسائیت کی رُوح، لڑکی سے عورت بنتے ہُوئے، جدید مشرق میں کس طرح ظہور کرے گی، اس کا اب تک کوئی اندازہ نہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پروین کا سفر رُکا نہیں، اسی لیے ہم بڑے اعتماد کے ساتھ مشرق کی اِس عورت کو اب اپنی مکمل اور اصلی شکل میں دیکھنے کی آرزو کرسکتے ہیں۔ ایک وقت تھا یہ بات ناممکن نظر آتی تھی، پروین نے اس ناممکن کو ممکن بنادیا ہے۔ اُس نے اپنے گرد پھیلے ہُوئے انتشار اور بکھراؤ سے حُسن کا جو پیکر تراشا ہے، وہ ایک پھُول بن کر ہمارے سامنے ہے۔ صد برگ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ پروین ایک عورت کی طرح دُکھ سہنا جانتی ہے۔ شاید مرد کی طرح دُکھ سہنا آسان ہو — اسی لیے ہم نے بڑی بڑی عورتوں کو مرد بنتے دیکھا ہے — تاہم اِس لڑکی کو کوئی جلدی نہیں، اِس لیے کہ اسے اپنے آپ سے باہر ہونے کی کوئی ہوس نہیں۔ وہ سچائی کے ساتھ وہی لکھنا چاہتی ہے جو محسوس کرتی ہے۔ خدا اس کی اِس سچائی کو زندہ رکھے۔ اس نے اپنے لیے بہت مشکل راہ انتخاب کی ہے؛ میرے نبیؐ کا قول ہے کہ خوشبو، عورت اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہی تو وہ عورت ہے کہ زمانہ جس کی تلاش میں ہے اور جسے دیکھنے کی ہمیں آرزو ہے۔ خوشبو کی شاعرہ اپنے سفر کی اس انتہا پر اس عورت کا ایک ادنیٰ سا رُوپ یا ہلکا سا عکس دِکھا سکے، تو یہ بیسویں صدی میں تخلیقی دُنیا کا عظیم ترین کارنامہ ہوگا۔

سجاد میر

رزقِ ہوا . . .

زندگی کے دشتِ بلا میں، سچائی جب اپنے وقتِ عصر کو پہنچ جائے، تو کون و مکاں میں صرف ایک پکار باقی رہ جاتی ہے . . . ہَل مِن ناصرٍ ینصرنا . . . ہَل مِن ناصرٍ ینصرنا . . . .

لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خودداری، دینارِ عزتِ نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں، وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے؟ وہاں تو سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں . . . اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے، مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انہوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا (اور اب مجھے دیوار میں چن دینا اُن کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا!) مگر وہ اپنی بھول سے بے خبر نہیں، سو اب میں ہوں اور رہنے کی مجبوری کا یہ اندھا کنواں جس کے گرد گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور آنکھیں پانی کی ——— کیونکہ میں نے اور لڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر دیا تھا! اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا!

ہر انکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا اور اضافہ ہو گیا ——— مگر میخیں ٹھونکنے والوں نے میری آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا ——— شاید وہ جانتے تھے کہ انہیں بجھانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، یا پھر اپنی سفاکیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے اور میں حیران ہوں کہ اس مسلسل گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں!

سنگینوں میں پروئے ہوئے بچے اور نیزوں پہ سجے ہوئے جوان سر میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے ——— اور میں قتل ہونے والوں کے نام تک نہیں پوچھ سکی ——— (کہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں) مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشن کا سماں رکھتی ہے ——— سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں!

بستی میں برفباری ہوئی، تو لوگوں نے ہاتھ تاپنے کے لیے گھر ہی جلا دیے اور جب تمام بستی شعلوں

کی پیشت میں آ گئی، تو سارے ہاتھ بلند تھے، مگر کسی کو سورۂ ابراہیم یاد نہ تھی!

بہار کی دُھوپ جب شہر کا رنگ جلانے لگے، تو سورج سے حرارت کی بجائے پناہ مانگی جاتی ہے لیکن بارشیں ہوئیں، تو کھلا کہ اپنے شہر کا رنگ ہی کچّا تھا!

اور رہا شہرِ جاں، تو سُرخ انگور سے چھنی ہوئی سرد ہَوا نے جس کی گلیوں میں گلابی اُچھال دی تھی بہار کی پہلی بارشوں نے جسے اس طرح چُوما تھا کہ زندگی سبز روشنی میں نہا گئی تھی، بادِ شمال نے جھوم کر جسے موسموں کے تن میں کہیں رگِ تاک کھول دی اور محبت کی اوک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی تھی، جہاں وجود کی بے ہُنر جڑوں تک نمو کی شبنم کچھ اِس طرح اُتر گئی تھی کہ بے برگ و بے ثمر شجر پھولوں کے بوجھ سے جُھک جُھک گئے، جہاں وجود کے سرمدی دُھندلکے میں آب و آتش کچھ یُوں بہم ہوئے کہ ہَوا نے مٹی کے آگے سر جھکا دیا اور قدموں کے نیچے تاروں کی طرح بچھی ہوئی رات، ساقی سے کچھ یُوں بل گئی کہ سپردگی کا نشہ ٹوٹتا نظر نہیں آتا تھا......

مگر جب زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی، تو سنڈریلا کی جُوتیاں ہی غائب تھیں، نہ وہ خواب تھا، نہ وہ باغ تھا، نہ وہ شہزادہ، اچھے رنگوں کی سب پریاں اپنے طلسمی دیس کو اُڑ چکی تھیں اور لہولہان ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتی شہزادی جنگل میں اکیلی رہ گئی ——— اور جنگل کی شام کبھی تنہا نہیں آتی! بھیڑیے اس کے خاص دوست ہوتے ہیں! شہزادی کے پاس بچاؤ کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ——— اُسے ایک ہزار راتوں تک کہانی کہنی ہے...... اور ابھی تو صرف ۲۰ راتیں ہی گزری ہیں!

مادرزاد منافقوں کی بستی میں زیست کرنے کا اور کوئی ہُنر نہیں ——— اور ہَوا سے بڑھ کر اور کون منافق ہوگا کہ جو صبح سویرے پھول کو چوم کر جگاتی بھی ہے اور شام ڈھلے اپنے حریص ناخونوں سے اُس کی پنکھڑیاں بھی نوچ لیتی ہے ——— قیمتِ شکست چُکانے میں جاں کا زیاں تو ایسی کوئی بات نہیں، مگر یہ پنکھڑی پنکھڑی ہو کر دربدر پھرنا یقیناً دُکھ دیتا ہے ——— ہَوا کا کوئی گھر نہیں، سو وہ کسی سر پہ چھت نہیں دیکھ سکتی!

——— مُمکن ہیں آندھیوں سے منسوب نہ ہوں، مگر ہَوا کے ہوتے ہوئے، ثمر کا شجر سے رابطہ رہنا بھی محال ہے ——— لیکن شجر کتنا ہی ویران کیوں نہ ہو، اُمیدِ بہار پیوستہ ہے، پھول کتنا ہی پامال کیوں نہ ہو، اچھے دنوں پر یقین کرنے والے، کوئی نہ کوئی شگون لے ہی لیتے ہیں۔ صد برگ بھی تمام تر ریزہ ریزہ ہونے کے باوصف، اسی یقین پر مُہرِ اثبات ہے ——— اور اس یقین کی کوئی ننھی سی کرن آپ کے دل تک بھی اُتر سکے، تو میں سمجھوں گی کہ میرے وجود کی ایک اور پنکھڑی رزقِ ہَوا ہونے سے بچ گئی!

پروین شاکر

جنوری ۱۹۸۰ء

جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو، یہ وہ درخت نہ تھا

جو خواب دیکھا تھا شہزادیوں نے پچھلے پہر
پھر اُس کے بعد مقدّر میں تاج و تخت نہ تھا

ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

مرے لیے تو وہ خنجر بھی پھول بن کے اُٹھا
زبان سخت تھی، لہجہ کبھی کرخت نہ تھا

اندھیری راتوں کے تنہا مسافروں کے لیے
دیا جلاتا ہُوا کوئی سازو رخت نہ تھا

گئے وہ دن کہ مجھی تک تھا میرا دکھ محدود
خبر کے جیسا یہ افسانہ لخت لخت نہ تھا

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

لوگ تھرّا گئے جس وقت منادی آئی
آج پیغام نیا ظلِّ الٰہی دیں گے

جھونکے کچھ ایسے تھپکتے ہیں گلوں کے رخسار
جیسے اس بار تو پت جھڑ سے بچا ہی دیں گے

ہم وہ شب زاد کہ سورج کی عنایات میں بھی
اپنے بچّوں کو فقط کور نگاہی دیں گے

آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہلِ کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے
تحفتاً پھر انھیں مقتول سپاہی دیں گے

۱۳

تمام لوگ اکیلے تھے، راہبر ہی نہ تھا
بچھڑنے والوں میں اک میرا ہم سفر ہی نہ تھا

برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا

تمہارے شہر کی ہر چھاؤں مہرباں تھی مگر
جہاں پہ دھوپ کڑی تھی، وہاں شجر ہی نہ تھا

سمیٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبو
ہوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہنر ہی نہ تھا

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

بدن میں پھیل گیا سُرخ بیل کی مانند
وہ زخم سوکھتا کیا، جس کا چارہ گر ہی نہ تھا

ہَوا کے لائے ہُوئے بیج پھر ہَوا کو گئے
کِھلے تھے پھُول کچھ ایسے کہ جن میں زر ہی نہ تھا

قدم تو ریت پہ ساحل نے بھی نہ رکھنے دیا
بدن کو جکڑے ہُوئے صرف اک بھنور ہی نہ تھا

کسی کی کھوج میں، پھر کھو گیا کون
گلی میں روتے روتے سو گیا کون

بڑی مدت سے تنہا تھے مرے دکھ
خدایا، میرے آنسو رو گیا کون

جلا آئی تھی میں تو آستیں تک
لہو سے میرا دامن دھو گیا کون

جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

ابھی تک بھائیوں میں دُشمنی تھی
یہ ماں کے خوں کا پیاسا ہو گیا کون

سندر، کومل سپنوں کی بارات گزر گئی جاناں!
دھوپ آنکھوں تک آپہنچی ہے رات گزر گئی جاناں!

بھور سمے تک جس نے ہمیں باہم اُلجھائے رکھا
وہ البیلی ریشم ایسی بات گزر گئی جاناں!

سدا کی دیکھی رات ہمیں اس بار ملی تو چپکے سے
خالی ہات پہ رکھ کے کیا سوغات گزر گئی جاناں!

کس کونپل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہو تم
اب تو دھوپ کا موسم ہے برسات گزر گئی جاناں!

لوگ نجانے کن راتوں کی مرادیں مانگا کرتے ہیں
اپنی رات تو وہ جو تیرے ساتھ گزر گئی جاناں!

اب تو فقط صیّاد کی دلداری کا بہانہ ہے ورنہ
ہم کو دام میں لانے والی گھات گزر گئی جاناں!

آنکھوں میں تھکن، دھنک بدن پر
جیسے شبِ اوّلیں دلہن پر

دستک ہے ہوائے شب کی تن پر
کُھلتا ہے نیا دریچہ فن پر

رنگوں کی جمیل بارشوں میں
اُتری ہے بہار پھول بن پر

تھامے ہوئے ہاتھ روشنی کا
رکھ آئی قدم زمیں، گگن پر

گزرا تھا کوئی شریر جھونکا
سلوٹ ہے قبائے یاسمن پر

شبنم کے لبوں پہ ناچتی ہے
چھایا ہے عجب نشہ کرن پر

کھلتی نہیں برگ وگل کی آنکھیں
جادو کوئی کر گیا چمن پر

خاموشی کلام کر رہی ہے
جذبات کی مُہر ہے سخن پر!

وصال

خمارِ لذت سے' ایک پل کو
جو آنکھیں چونکیں،
تو نیم خوابیدہ سرخوشی میں
غرورِ تاراجگی نے سوچا
خدائے برتر کے قہر سے
آدم اور حوّا
بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپردگی کی اسی حسیں انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح
ہم بدن اور ہم خواب و ہم تمنّا

بچ رہا تھا اک پرندہ ڈال پر ہنستا ہُوا
جال وہ پھینکے ہوا نے، وہ بھی پر بستہ ہُوا

دے کے مجھ کو اذن گہرے پانیوں کی سیر کا
خود روانہ ہے وہ میری رسّیاں کستا ہُوا

شہر کی ہر رہگزر پر برف خیمہ زن ہوئی
بند اگلے چاند تک اب دھوپ کا رستہ ہُوا

جو ہوا آئی، مرے چہرے پہ پاؤں رکھ گئی
اونچی شاخوں کا شگوفہ برگِ نو رستہ ہُوا

ریت پر لکھا گیا یا سطحِ موجِ آب پر
نام جو اُس آنکھ کی وحشت سے وابستہ ہُوا

بختِ رسوائی کہ کوئی اپنی نظروں میں گرا
اور کوئی مصر کے بازار میں سستا ہُوا

چاند کا پیغام دھندلا تھا نہ چہرہ حرف کا
شہر کے سارے دریچوں پر ہے پردہ برف کا

یہ ہوا کی سرد مہری تھی کہ میرے دل کا خوف
جم گیا ہے ہونٹ پر آ کر تنفّس حرف کا

دیکھ کر قاتل کے نیچے در گزر کرتا قصاص
کون تھا مقتول کے پیاروں میں اتنے ظرف کا

ایک وہ موسم کہ مجھ پر مسکراہٹ جبر تھی
اور اب موقع نہیں ملتا ہنسی کے صرف کا

ہاتھ بھی جھلسے، بدن بھی بے اماں ہو کر رہا
چھوڑ کر مٹی، بنایا جب گھروندہ برف کا

بج اُٹھے ہوا کے دف، وجد میں کلی آئی
زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی

میں بھی کتنی بھولی تھی، ایک لطفِ مبہم پر
رقص گہ میں گرگابی چھوڑ کر چلی آئی

چشم و دل کے سب آنسو اس ہوا میں کھِل اُٹھے
شاخسارِ مژگاں پر رُت گلاب کی آئی

شہر کے شگوفوں کے نیم رس سے اُکتا کر
تازگی سے ملنے کو بن میں تیتری آئی

اس سے قبل بھی سائے کب قریب آئے تھے
اس نئے سفر میں بھی کام دھوپ ہی آئی

دھوپ سات رنگوں میں پھیلتی ہے آنکھوں پر
برف جب پگھلتی ہے اُس کی نرم پلکوں پر

پھر بہار کے ساتھی آ گئے ٹھکانوں پر
سرخ سرخ گھر نکلے سبز سبز شاخوں پر

جسم و جاں سے اُترے گی گرد پچھلے موسم کی
دھو رہی ہیں سب چڑیاں اپنے پنکھ چشموں پہ

ساری رات سوتے میں مسکرا رہا تھا وہ
جیسے کوئی سپنا سا کانپتا تھا ہونٹوں پر

تتلیاں پکڑنے میں دور تک نکل جانا
کتنا اچھا لگتا ہے پھول جیسے بچوں پر

لہر لہر کرنوں کو چھیڑ کر گزرتی ہے
چاندنی اُترتی ہے جب شریر جھرنوں پر

پھول سو بھی جائیں تو روشنی نہیں بجھتی
سبز دُوب کی آنکھیں جاگتی ہیں رستوں پر

بس اے بہار کے سورج! بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دھوپ میرے شہر کا رنگ

شجر کو سبز قبا دیکھ کر یہ اُلجھن ہے
کہاں یہ رنگِ نمو ہے، کہاں یہ زہر کا رنگ

کنارِ جُوئے رواں جب سے قتل گاہ بنی!
ہجوم اُمڈنے لگا دیکھنے کو نہر کا رنگ

ابھی تو میں نے سمندر میں ناؤ ڈالی تھی
یہ کیا ہُوا کہ بدلنے لگا ہے لہر کا رنگ

یہ احتجاج بجا ہے کہ تیز تھی بارش
یہ ماننا ہے کہ کچا تھا اپنے شہر کا رنگ

گلہ ہی کیا ہے اگر وہ بھی سبز چشم ہُوا
طبیعتوں پہ تو چڑھتا رہا ہے دہر کا رنگ

وہ آج بھی مجھے سوتے میں ڈسنے آئے گا
وہ جانتا ہے کہ کھِلتا ہے مجھ پہ زہر کا رنگ

اُترنے پائے گا قوسِ قزح کا تھام کے ہاتھ
سوادِ حرف میں کب عشقِ بے سپہر کا رنگ

امیرِ شہر سے سائل بڑا ہے
بہت نادار لیکن دل بڑا ہے

لہو جمنے سے پہلے خوں بہا دے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

چٹانوں میں گھِرا ہے اور چُپ ہے
سمندر سے کہیں ساحل بڑا ہے

کسی بستی میں ہو گی سچ کی حُرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

جو ظلّ اللہ پر ایمان لائے
وہی داناؤں میں عاقل بڑا ہے

اُسے کھو کر بہائے درد پائی
زیاں چھوٹا تھا اور حاصل بڑا ہے

پرو دیے مرے آنسو ہوا نے شاخوں میں
بھرم بہار کا باقی رہے نگاہوں میں

صبا تو کیا کہ مجھے دھوپ تک جگا نہ سکی
کہاں کی نیند اُتر آئی ہے ان آنکھوں میں

کچھ اتنی تیز ہے سرخی کہ دل دھڑکتا ہے
کچھ اور رنگ پسِ رنگ ہے گلابوں میں

سپردگی کا نشہ ٹوٹنے نہیں پاتا
اَنا سمائی ہوئی ہے وفا کی باہوں میں

بدن پہ گرتی چلی جا رہی ہے خواب سی برف
خنک سپیدی گھلی جا رہی ہے سانسوں میں

شام آئی، تری یادوں کے ستارے نکلے
رنگ ہی غم کے نہیں، نقش بھی پیارے نکلے

ایک موہوم تمنّا کے سہارے نکلے
چاند کے ساتھ ترے ہجر کے مارے نکلے

کوئی موسم ہو مگر شانِ خم و پیچ وہی
رات کی طرح کوئی زلف سنوارے نکلے

رقص جن کا ہمیں ساحل سے بہا لایا تھا
وہ بھنور آنکھ تک آئے تو کنارے نکلے

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

عشق دریا ہے، جو تیرے وہ تہی دست رہے
وہ جو ڈوبے تھے، کسی اور کنارے نکلے

دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اُگاتا کیسے
شاخ پھوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

پا بہ گل سب ہیں، رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جرم کو تحریر کون

آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون

کوئی مقتل کو گیا تھا مدّتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صورتِ تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری، پھر دے گیا تشہیر کون

سچ جہاں پابستہ، ملزم کے کٹہرے میں ملے
اُس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندا کر گیا تعمیر کون

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہُوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے، کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آ گئی ہوتی ہوئی سر سے

برسا بھی تو کس دشت کے بے فیض بدن پر
اک عمر مرے کھیت تھے جس ابر کو ترسے

اس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اُس بوڑھے شجر سے

محنت مری آندھی سے تو منسوب نہیں تھی
رہنا تھا کوئی ربط شجر کا بھی ثمر سے

خود اپنے سے ملنے کا تو یارا نہ تھا مجھ میں
میں بھیڑ میں گم ہو گئی، تنہائی کے ڈر سے

بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیا غم
منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے

پتھرایا ہے دل یوں کہ کوئی اسم پڑھا جائے
یہ شہر نکلتا نہیں جادو کے اثر سے

نکلے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہو گی
سورج بھی مگر آئے گا اس راہگزر سے

اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اُس کی طرح یاد کرے

دل عجب شہر کہ جس پر بھی کھلا دراُس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

اتنا حیراں ہو مری بے طلبی کے آگے
وا قفس میں کوئی در خود مرا صیّاد کرے

سلبِ بینائی کے احکام ملے ہیں جو کبھی
روشنی چھُونے کی خواہش کوئی شب زاد کرے

سوچ رکھنا بھی جرائم میں ہے شامل اب تو
وہی معصوم ہے، ہر بات پہ جو صاد کرے

جب لہو بول پڑے اُس کے گواہوں کے خلاف
قاضیِ شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

اُس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو، اب مجھے آزاد کرے

ہجر کی شب کا کسی اسم سے کٹنا مشکل
چاند پُورا ہے تو پھر درد کا گھٹنا مشکل

موجۂ خواب ہے وہ اُس کے ٹھکانے معلوم
اب گیا ہے تو یہ سمجھو کہ پلٹنا مشکل

جن درختوں کی جڑیں دل میں اُتر جاتی ہیں
اُن کا آندھی کی درانتی سے بھی کٹنا مشکل

قوتِ غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹنا مشکل

اُس سے ملتے ہوئے چہرے بھی بہت ہونے لگے
شہر کے شہر سے اک ساتھ نمٹنا مشکل

اب کے بھی خوشوں پہ کچھ نام تھے پہلے سے لکھے
اب کے بھی فصل کا دہقانوں میں بٹنا مشکل

شکستہ پائی ارادوں کے پیش و پس میں نہیں
دل اُس کی چاہ میں گُم ہے جو میرے بس میں نہیں

براہِ روزنِ زنداں ہوا تو آتی تھی
کھُلی فضا میں گھٹن وہ ہے جو قفس میں نہیں

قبائے جاں جسے چھُوتے ہی چمپئی ہو جائے
وہ شعلگی کسی فصلِ حنا نفس میں نہیں

کسی وصال خبر رُت کی مہرباں آمد
ہمیں قبول — مگر ہجر کے برس میں نہیں

عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا میری
کرن کا عکس بھی اب میری دسترس میں نہیں

دلوں کا حال تو بین السطور لکھتے ہیں
کلیدِ حرف کتابوں کے پیش رس میں نہیں

رستہ بھی کٹھن، دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اُس کو محبت بھی بہت تھی

خیمے نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں، مسافت بھی بہت تھی

سب دوست مرے منتظرِ پردۂ شب تھے
دن میں تو سفر کرنے میں دقت بھی بہت تھی

بارش کی دعاؤں میں نمی آنکھ کی مل جائے
جذبے کی کبھی اتنی رفاقت بھی بہت تھی

کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

وہ بھی سرِ مقتل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقفِ احوالِ عدالت بھی بہت تھی

اس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

خوش آئے تجھے شہرِ منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

جتنا ہو فزوں، عطائے رب ہے
تخلیق کا کرب بھی عجب ہے

اس خواب کی لَو کو مت بجھانا
یہ میرا چراغِ نیم شب ہے

سورج نے کبھی تو سوچا ہوتا
کیا میرے زوال کا سبب ہے

کب اُس کے وصال میں ہُوا تھا
وہ حال جو تیرے دل کا اب ہے

ملنے کا تو مسئلہ نہیں ہے

پہچان بھی ہائے، بات تب ہے

خود ڈھونڈ رہا ہے آبِ حیواں

اور پیچھے قبیلہ جاں بلب ہے

بچھڑا ہے جو اک بار تو ملتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سلتے نہیں دیکھا

اِک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اُس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم آئے گی لیکن
تتلی کے پروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

کس طرح مری روح ہری کر گیا آخر
وہ زہر جسے جسم میں کھلتے نہیں دیکھا

تجھ سے تو کوئی گلہ نہیں ہے
قسمت میں مری صلہ نہیں ہے

بچھڑے تو نجانے حال کیا ہو
جو شخص ابھی ملا نہیں ہے

جینے کی تو آرزو ہی کب تھی
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

جو زیست کو معتبر بنا دے
ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے

خوشبو کا حساب ہو چکا ہے
اور پھول ابھی کھِلا نہیں ہے

سرشاریٔ رہبری میں دیکھا
پیچھے مرا قافلہ نہیں ہے

اک ٹھیس پہ دل کا پھُوٹ بہنا
چھُونے میں تو آبلہ نہیں ہے!

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریت سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر

زمیں انکار کے نشے میں گم ہے
فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

بشارت دے کوئی تو آسماں سے
کہ اک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر

دریچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرفِ تعلق ہو اضافی
محبت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

گھروں پر جبر یہ ہو گی سفیدی
کوئی عزت مآب آنے کو ہے پھر

فصیلِ شہر پر تھی ضرب کاری
کہاں داروں کا شوقِ شہریاری

کہاں فن کار کو مر کے بھی حاصل
عذابِ زندگی سے رستگاری

ہجومِ رنگ میں بھی دل کا مسلک
کسی عہدِ وفا کی پاسداری

اُسی چہرے سے اوروں کی پرکھ ہے
ابھی تک ہے وہی اک شکل پیاری

وہ جب خود ٹوٹنے والا ہُوا تھا
میں ہاری بھی تو کیسے وقت ہاری!

زمیں ماں کی طرح ہے، ہر ستم پر
بس اک حرفِ دعا ہونٹوں سے جاری

— ق —

کسی بیمار کی بیعت میں روشن
ہماری گردنوں پر سرخ دھاری

اسیرِ کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

سنگ پگھل بھی جاتے ہیں
جادو چل بھی جاتے ہیں

دیر تلک نم رہنے سے
آنچل گل بھی جاتے ہیں

دو رویہ پیڑوں کے بیچ
رستے جل بھی جاتے ہیں

صرف ہوا پر کیوں تعزیر
پھول مسل بھی جاتے ہیں

بس نریاق نہ کھوج کے بیٹھ
سانپ نگل بھی جاتے ہیں

طاؤسی یادوں کے دُکھ
زخم کو جھل بھی جاتے ہیں

دیکھ اپنی شادابی کو
آنسو پھیل بھی جاتے ہیں

دریا پار یہ سوچ کے چل
گھڑے بدل بھی جاتے ہیں

خزاں کی رُت میں لمحۂ جمال کیسے آگیا
یہ آج پھر سنگھار کا خیال کیسے آگیا

ہنسی کو اپنی سُن کے ایک بار میں بھی چونک اُٹھی
یہ مجھ میں دکھ چُھپانے کا کمال کیسے آگیا

وہ رسمِ چارہ سازئ جنوں تو ختم ہو چکی
یہ دل کے نام حرفِ اندمال کیسے آگیا

ابھی تو دھوپ روزنِ قفس سے کوسوں دور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آگیا

جدائیوں کے زخم تو، سنا کہ، بھر چلے تھے، پھر
بدن کے ہاتھ ناخنِ وصال کیسے آگیا

تمام کائنات ازل سے آئنوں کی زد پہ تھی
ہجومِ عکس میں یہ بے مثال کیسے آگیا

گھر کی یاد ہے اور درپیش سفر بھی ہے
چوتھی سمت نکل جانے کا ڈر بھی ہے

لمحۂ رخصت کے گونگے سنّاٹے کی
ایک گواہ تو اُس کی چشمِ تر بھی ہے

عشق کو خود دریوزہ گری منظور نہیں
مانگنے پر آئے تو کاسۂ سر بھی ہے

نئے سفر پہ چلتے ہُوئے یہ دھیان رہے
رستے میں دیوار سے پہلے در بھی ہے

جن پیڑوں کے ہرا رہنے کی دعا کی تھی
اُن میں آج سے شامِل زخمِ ہنر بھی ہے

بہت سے ناموں کو اپنے سینے میں چھپائے
جلی ہُوئی بستی میں ایک شجر بھی ہے

وہی خیال کہ آنکھوں تک رہ جائے تو اشک
مصرعۂ تر بن جائے تو سلکِ گہر بھی ہے

سُوکھ گیا خود اپنے دل کی نرمی سے
پیڑ کو کیا معلوم تھا، بیل امر بھی ہے

غزالِ شوق کی وحشت عجب تھی
کسی خوش چشم سے نسبت عجب تھی

ہجومِ چشم و رخسار و دہن میں
جو تنہا کر گئی صورت عجب تھی

وہ تردیدِ وفا تو کر رہا تھا
مگر اُس شخص کی حالت عجب تھی

مری تقدیر کی نیرنگیوں میں
مری تدبیر کی شرکت عجب تھی

سرِ مقتل کسی کے پیرہن میں
گلابی رنگ کی حدت عجب تھی

بدن کا پہلے پہلے آگ چکھنا
رگ و پے میں کوئی لذّت عجب تھی

اُسی طرح سے ہر اک زخم خوشنما دیکھے
وہ آئے تو مجھے اب بھی ہرا بھرا دیکھے

گزر گئے ہیں بہت دن رفاقتِ شب میں
اک عمر ہو گئی چہرہ وہ چاند سا دیکھے

مرے سکوت سے جس کو گلے رہے کیا کیا
بچھڑتے وقت ان آنکھوں کا بولنا دیکھے

ترے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

بس ایک ریت کا ذرّہ بچا تھا آنکھوں میں
ابھی تلک جو مسافر کا راستہ دیکھے

اُسی سے پوچھے کوئی دشت کی رفاقت۔ جو
جب آنکھ کھولے، پہاڑوں کا سلسلہ دیکھے

تجھے عزیز تھا اور میں نے اُس کو جیت لیا
مری طرف بھی تو اک پل ترا خدا دیکھے

موجیں بہم ہوئیں تو کنارہ نہیں رہا
آنکھوں میں کوئی خواب دوبارہ نہیں رہا

گھر بچ گیا کہ دور تھے کچھ صاعقہ مزاج
کچھ آسمان کا بھی اشارہ نہیں رہا

بھولا ہے کون ایڑ لگا کر حیات کو
رُکنا ہی رخشِ جاں کو گوارا نہیں رہا

جب تک وہ بے نشان رہا، دسترس میں تھا
خوش نام ہو گیا تو ہمارا نہیں رہا

گم گشتۂ سفر کو جب اپنی خبر ملی
رستہ دکھانے والا ستارہ نہیں رہا

کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں رہا!

ہاں — ابھی دُعائے نور پڑھی جا سکتی ہے

ہاں — ابھی دعائے نور پڑھی جا سکتی ہے،
ردِ بلا کے اسم ابھی تک اپنی تاثیروں سے منافق نہیں ہوئے
حرفِ دعا میں آس کی لَو تابندہ ہے!
ٹوٹنے والی سانسوں کا اک تار
کسی اَن دیکھے مسیحا کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے،
دو دشمن دنیاؤں کے مابین زمینِ بے ملکیت کی حد پر
کوئی خزاں توں جیسا ذہن
رہ رہ کے کچھ بھول رہا ہے

آنکھوں پر اُس لمحۂ آخر کی سیال روپہلی جھلّی چڑھنے لگی ہے

جس کو چھُونے سے سورج کے ہاتھ بھی

برف کے ہو جائیں گے

آنے والوں کی صورت کجلانے لگی ہے

پھر بھی آنکھیں ہیں کہ دروازے سے لگی ہیں!

کوئی نجات دہندہ ـــــ شافعِ روزِ قیامت

کوئی سب باتوں کا جاننے والا ـــــ میرے علیم و خبیر

کوئی معجزے والا ہاتھ ـــــ اے موسیٰ کے خدا

کوئی جلانے والی سانس ـــــ اے ربِّ عیسیٰ

کوئی محبّت والی آنکھ ـــــ اے محبوبِ محمّدؐ!

زمیں پہ پاؤں تھے، قیام آسماں میں تھا
مری طرح سے وہ شخص بھی امتحان میں تھا

یہ روشنی تھی کہ اُس کا چہرہ دھیان میں تھا
ستارہ سا اک چراغ میرے مکان میں تھا

کہ چاند خود آکے ایک تارے کا نام پوچھے
ہجومِ سیارگاں! یہ کس کے گمان میں تھا

میں اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں
نظر کا ایسا طلسم کس داستان میں تھا

میں اُس کی کشتی سے اپنا آنچل ہٹا کے سمجھی
سفر کا بھی حوصلہ فقط بادبان میں تھا

دعا کبھی میں نے مانگی تھی دونوں وقت ملتے
یہ زندگی بھر کا جھٹپٹا کب دھیان میں تھا

جدائی کا فیصلہ تو پھر بھی ہمارا ہوتا
یہ مان بھی لیں اگر کوئی درمیان میں تھا

قدموں میں بھی تکان تھی، گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا

نکلے اگر تو چاند دریچے میں رُک بھی جائے
اس شہرِ بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

آندھی نے اُن رُتوں کو بھی بے تاج کر دیا
جن کا کبھی ہُما سا پرندہ نقیب تھا

کچھ اپنے آپ سے ہی اُسے کشمکش نہ تھی
مجھ میں بھی کوئی شخص اُسی کا رقیب تھا

پوچھا کسی نے مول تو حیران رہ گیا
اپنی نگاہ میں کوئی کتنا غریب تھا

مقتل سے آنے والی ہوا کو بھی کب ملا
ایسا کوئی دریچہ کہ جو بے صلیب تھا

سبھی گناہ دُھل گئے، سزا ہی اور ہو گئی
مرے وجود پر تری گواہی اور ہو گئی

رفوگرانِ شہر بھی کمال لوگ تھے مگر
ستارہ ساز ہاتھ میں قبا ہی اور ہو گئی

بہت سے لوگ شام تک کواڑ کھول کر رہے
فقیرِ شہر کی مگر صدا ہی اور ہو گئی

اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ ساز گار تھا
چراغ کیا جلا دیا، ہوا ہی اور ہو گئی

بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو
وہ گل کھلے کہ شوخیٔ صبا ہی اور ہوگئی

نجانے دشمنوں کی کون بات یاد آگئی
لبوں تک آتے آتے بد دعا ہی اور ہوگئی

یہ میرے ہاتھ کی لکیریں کھل رہی تھیں یا کہ خود
شگن کی رات خوشبوئے حنا ہی اور ہوگئی

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانہ کی جو شہ ملی
عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہوگئی

سحاب بن کے تو وہ بھی صبا مثال ہی تھا
کسی کے واسطے رُکنا ذرا محال ہی تھا

ہزار آئنے جس جا ہوں رو کشِ خورشید
نگاہ بھر کے اُسے دیکھنا کمال ہی تھا

یہ کیا کہ ہلنے لگے قصر و کاخِ پرویزی
گدائے عشق کے کیسے میں اک سوال ہی تھا

بچھڑ کے وہ، مجھے لوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانحہ مرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

پرند اپنی رضا سے زمین پر اُترا
وگرنہ ایسی ہوا تھی نہ ایسا جال ہی تھا

ہرا رکھا مجھے جس نے بہ وصفِ چارہ گراں
وہ معجزہ مرا اندوہِ اندمال ہی تھا

قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی تھی
پر میں کیا کرتی کہ زنجیر ترے نام کی تھی

جس کے ماتھے پہ مرے بخت کا تارہ چمکا
چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی تھی

میں نے ہاتھوں کو ہی پتوار بنایا ورنہ
ایک ٹوٹی ہوئی کشتی مرے کس کام کی تھی

وہ کہانی کہ ابھی سوئیاں نکلی بھی نہ تھیں
فکر ہر شخص کو شہزادی کے انجام کی تھی

یہ ہوا کیسے اُڑا لے گئی آنچل میرا
یوں ستانے کی تو عادت مرے گھنشام کی تھی

بوجھ اُٹھائے ہوئے پھرتی ہے ہمارا اب تک
اے زمیں ماں! تری یہ عمر تو آرام کی تھی

پلکیں نہ جھپکنی تھیں کہ گفتار عجب تھی
آنکھوں کے لیے ساعتِ دیدار عجب تھی

خاموش تھے لب، صوتِ اقرار عجب تھی
کیا کہنے صفائی ہیں کہ سرکار عجب تھی

پھر جمنے لگے، دیکھ، مرے پاؤں زمیں پر
غربت میں ترے شہر کی دیوار عجب تھی

امکانِ بہار اس سے بھی دل کٹنے لگا تھا
اور برگِ تمنّا کی بھی کچھ دھار عجب تھی

صحرا میں پلٹ کے میں کسے دیکھتی لیکن
آواز سی اک زمزمہ آثار عجب تھی

جھکتی ہی گئی زعم میں دیوار کے اس پار
تقدیر تری شاخِ ثمردار عجب تھی

اک لمحۂ پرّاں کی بھی قیمت نہیں چھوٹی
یہ سلطنتِ درہم و دینار عجب تھی!

دستار کے بل گن سکے جہاں ملتی ہو عزت
اس شہر میں توقیرِ سخن کار عجب تھی!

ہوا نژاد اور آج ہے گوشہ گیر ایسا
رگِ گلو میں ہُوا ہے پیوست تیر ایسا

نہ آپ کھلتا نہ میرا احوال پوچھتا ہے
رہِ وفا میں یہ مل گیا کون میسّر ایسا

بندھے ہُوئے ہاتھ کا بھی اس کو ملال کب ہے
شریکِ پرواز کر رہا ہے اسیر ایسا

نہ مٹ سکے گا، کوئی مرے شیشہ گر سے کہہ دے
جو فاصلہ پڑ گیا دلوں میں لکیر ایسا

میں دونوں ہاتھوں کو چھوڑ کر چل رہی ہوں پھر بھی
مرا ارادہ کھڑا ہے اک دستگیر ایسا

چٹان چھوڑ کے شاہیں سرِ نہال آیا
کہ عمر بھر کی ریاضت پہ خاک ڈال آیا

سگانِ راہ و طفلانِ شہر کیا کرتے
فقیہہِ وقت تو دستار خود اُچھال آیا

ستارہ پہلے کبھی اس قدر نہ تھا روشن
یہ کون ہاتھ مرے بخت کو اُجال آیا

زمانے نے جسے بے تیشہ کر دیا تھا کبھی
پہاڑ کاٹ کر خود راستہ نکال آیا

یہی نہیں کہ مجھے اس نے تھام رکھا ہے
مرا خیال بھی اس کو کبھی سنبھال آیا

ستارہ داں! تو مرا زائچہ دوبارہ دیکھ
ترے کہے میں نہ آیا، عجیب سال آیا

یہ کس کا سامنا کرنے سے حرف لرزاں ہیں
سخن شناسوں میں یہ کون باکمال آیا

کفِ گلاب سے خوشبو ہی چُن سکا تو بہت
جو میرے گھر میں ہمیشہ ہوا مثال آیا

کوئی ستارہ مرے ساتھ ساتھ چلنے لگا
سفر میں جیسے ہی مجھ کو ترا خیال آیا

بہاؤ تیز تھا طوفانِ ابر و باد بھی تھا
فصیلِ شہر کو دریا سے کچھ عناد بھی تھا

غبار ہونے سے پہلے ہوا کو یاد بھی تھا
سوادِ سنگ میں اک آئنہ نژاد بھی تھا

ہزار بار ہوئی بند جس پہ شہر پناہ
سنا گیا ہے کہ وہ شخص شہرزاد بھی تھا

جو بے نیازِ ستائش بنا رہا تھا مجھے
اسی کے ہاتھ میں دیکھا تو سنگِ داد بھی تھا

ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہی
مَیں آئنہ تھی، بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

اِک ایسے گھر کا ٹھہرنا تو معجزہ سمجھیں
جو بے ستون بھی تھا اور کج نہاد بھی تھا

وہ باکمال کہ التزامِ عشق جس پہ ہُوا
بنامِ حُسن اِسے حقِ اجتہاد بھی تھا

قضا نے مرے نام کی لوح بھر دی
مری جان! تو نے بہت دیر کر دی

زمیں کرۂ زمہریری میں آئی
فضا میں ہے پت جھڑ سے پہلے کی سردی

قفس کی تو خود تیلیاں مڑ گئی ہیں
پرندے کو کس نے نوید سفر دی

یہ کیسے شکاری نے جکڑا ہے مجھ کو
کہ خود میں نے اڑنے کی خواہش کتر دی

ہوائے زمستاں نے کیا گل کھلائے
دمِ واپسیں شاخ کی گود بھر دی

اسی سے طلب حرفِ آخر کی رکھوں
وہی جس نے توفیقِ عرضِ ہنر دی

ہوا کی طرح سے نہیں اختیاری
کسی بے ٹھکانہ کی آوارہ گردی

محبّت کی تاریخ میں کب نئی ہے
کسی آبلہ پا کی صحرا نوردی

حسابِ عداوت بھی ہوتا رہے گا
محبّت نے جینے کی مہلت اگر دی

مَیں پھر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
رضائے الٰہی کی تکمیل کر دی

شام! مَیں توری گیّاں چراؤں!

آنکھ جب آئینے سے ہٹائی

شام سندر سے رادھا لِ آئی

آئے سپنوں میں گوکل کے راجہ

دینے سکھیوں کو آئی بدھائی

پریم جل خوب گاگر میں بھر لوں

آج بادل نے مایا لٹائی

کس کو سنگھٹ پہ جانے کی ضد تھی

کس سے گاگر نے بنتی کرائی

اوک سے پانی بہنے لگا تو!

پیاس گِردھر کی کیسے بجھائی

اب تو جل کا ہی آنچل بنا لوں

پیڑ پر کیوں چڑیا سکھائی

اس ہی بالک سے نندیا ملے گی

جس نے ماتھے کی بندیا چرائی

رنگ ڈالی مری آتما تک

کیا منوہر کے من میں سمائی

مَیں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا

بیری پائل نے ہی حبا لگائی

گوپیوں سے بھی کھیلیں کنہیا

اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی

کوئی خوشبو تو اچھی لگے گی

پھول بھر بھر کے آنچل میں لائی

شام: مَیں توری گیّاں چراؤں

مول لے لے تو میری کمائی

کرشن گوپال رستہ ہی بھُولے

رادھا پیاری تو سُدھ بھُول آئی

سارے سُر ایک مُرلی کی دُھن میں

ایسی رچنا بھلا کس نے گائی

کیسا بندھن بندھا شام مورے

بات تیری سمجھ میں نہ آئی

ہاتھ پھُولوں سے پہلے بنے تھے

یا کہ گجرے سے پھوٹی کلائی!

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے

ایک مٹھی ریت میں کیسے رہے
اس سمندر کا کنارہ اور ہے

موج کے مڑنے میں کتنی دیر ہے
ناؤ ڈالی اور دھارا اور ہے

جنگ کا ہتھیار طے کچھ اور تھا
تیر سینے میں اتارا اور ہے

متن میں تو جرم ثابت ہے مگر
حاشیہ سارے کا سارا اور ہے

ساتھ تو میرا زمیں دیتی مگر
آسماں کا ہی اشارہ اور ہے

دھوپ میں دیوار ہی کام آئے گی
تیز بارش کا سہارا اور ہے

ہارنے میں اک انا کی بات تھی
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

سکھ کے موسم انگلیوں پر گن لیے
فصلِ غم کا گوشوارہ اور ہے

دیر سے پلکیں ہنسیں جھپکیں مری
پیشِ جاں اب کے نظارہ اور ہے

اور کچھ پل اس کا رستہ دیکھ لوں
آسماں پر ایک تارہ اور ہے

حد چراغوں کی یہاں سے ختم ہے
آج سے رستہ ہمارا اور ہے

———

اس کی ثنا میں حدِ بیاں سے نکل چکا
دل کا یہ حال ہے تو یہاں سے نکل چکا

اِک حرفِ تلخ میری زباں سے نکل چکا
کیا عذر ہو کہ تیر کماں سے نکل چکا

بانٹی تھی جس نے عام معافی کی خود نوید
وہ راتوں رات شہرِ اماں سے نکل چکا

اب زندگی چراغ بکف آئی بھی تو کیا
اِک آدمی تو اپنے مکاں سے نکل چکا

آنکھوں نے بھی یہ جان لیا ہے کہ کوئی شخص
اک خواب تھا کہ عرصۂ جاں سے نکل چکا

چھڑانا سہل ہو گیا ہے ہات درمیان میں
خدا کا شکر پڑ رہی تھی رات درمیان میں

عجب بساط ہے کہ جیتنے کا ذکر ہی نہیں
فریق دونوں چاہتے ہیں مات درمیان میں

اشارہ کوچ کا تو ہو چکا ہے دیر سے مگر
بچھا رکھی ہے زندگی نے گھات درمیان میں

فصیلِ شوق پر کمند ڈالنا تو کچھ نہ تھا
مگر کہ پڑ رہا تھا شہرِ ذات درمیان میں

کھُلا یہ بعدِ گفتگو کہ حاصلِ سخن رہی
وہی، جو کٹ رہی تھی ایک بات درمیان میں

ابھی تو سات قحط اور سات بارشیں بھی ہیں
یہ کون مانگنے لگا نجات درمیان میں

بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں ، تم کنارہ دیکھنا

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مُڑ کر دوبارہ دیکھنا!

کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں ! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسپا ہوئے
ان ہی لوگوں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا

جب بنامِ دل گواہی سر کی مانگی جائے گی
خون میں ڈوبا ہُوا پرچم ہمارا دیکھنا

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی ہارنے میں کیا خسارہ دیکھنا

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

کیسا ثبات ہے نہ روانی بھی ساتھ ہے
واپس ہیں اور ناؤ میں پانی بھی ساتھ ہے

آسیب کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں، نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے

یونہی نہیں بہار کا جھونکا بھلا لگا
تازہ ہوا کے، یادِ پرانی بھی ساتھ ہے

ہر قصّہ گو نے دیدۂ بے خواب سے کہا
اک نیند لانے والی کہانی بھی ساتھ ہے

ہجرت کا اعتبار کہاں ہو سکے کہ جب
چھوڑی ہوئی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

گواہی کیسے ٹوٹتی، معاملہ خدا کا تھا
مرا اور اس کا رابطہ تو ہاتھ اور دعا کا تھا

گلاب قیمتِ شگفت شام تک چکا سکے
وہ دھوپ کو ادا ہُوا جو قرض کر صبا کا تھا

بکھر گیا ہے پھول تو ہمیں سے پوچھ گچھ ہوئی
حساب باغباں سے ہے، کیا دھرا ہوا کا تھا

لہو چشیدہ ہاتھ اس نے چوم کر دکھا دیا
جزا وہاں ملی جہاں کہ مرحلہ سزا کا تھا

جو بارشوں سے قبل اپنا رزق گھر میں بھر چکا
وہ شہرِ مور سے نہ تھا پہ دور بیں بلا کا تھا

بُجھ گئی آنکھ تو پیراہنِ تر کیا لانا
چاہ سے اب مرے یوسف کی خبر کیا لانا

جب مسافر کا ارادہ ہی بھٹکنے کا ہُوا
اِک چراغ اور سرِ راہگزر کیا لانا

رات ہم خانہ خرابوں کا بھرم رکھ لیتی
روشنی رہتے میں مہمان کو گھر کیا لانا

شب گزار و بادہ ستارہ تو مرا ڈوب چکا
اب دمِ صبح دعاؤں میں اثر کیا لانا

اک دیا بجھ ہی گیا ہوگا سرِ طاقِ اُمید
ورنہ پیغام ہواؤں کو ادھر کیا لانا

شہر میں سانپ جب انسانوں سے نایاب ہو جائیں
پیشِ آئینہ کوئی ذہن میں ڈر کیا لانا

اتنی مہلت ہے کہ میں مشک میں پانی بھر لوں؟
فاصلہ کم ہو تو پھر زادِ سفر کیا لانا!

شگون

سات سہاگنیں اور میری پیشانی !
صندل کی تحریر
بھلا پتھر کے لکھے کو کیا دھوئے گی
بس اتنا ہے
جذبے کی پُوری نیکی سے
سب نے اپنے اپنے خدا کا اسم مجھے دے ڈالا ہے
اور یہ سُننے میں آیا ہے
شام ڈھلے، جنگل کے سفر میں
اسم بہت کام آتے ہیں

تو نے کبھی سوچا

گلہ کم گوئی کا مجھ سے بجا ہے

لیکن اے جانِ سخن!

تو نے کبھی سوچا

کہ تیری سمت جب میں آنکھ بھر کر دیکھتی ہوں تو

مری ہلکی سنہری جلد کے نیچے

اچانک

اتنے ڈھیروں ننھے ننھے سے دیئے کیوں جلنے لگتے ہیں؟

بلاوا

میں نے ساری عمر
کسی مندر میں قدم نہیں رکھا ،
لیکن جب سے
تیری دعاؤں میں
میرا نام شریک ہوا ہے ،
تیرے ہونٹوں کی جنبش پر
میرے اندر کی داسی کے اُجلے تن میں
گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں !

محبت آشنا

میں تجھ سے مل کے جونہی باہر آئی
مارچ کی تیکھی ہوا،
بچپن کے ساتھی کی طرح سے،
رنگ کی پچکاریاں تھامے کھڑی تھی،
قبل اس کے
میں ہوا کی مسکراہٹ کو سمجھ پاتی،
مری پیاری سہیلی
رنگ میں مجھ کو بھگوتی، کھلکھلاتی، ناچتی،

پل بھر میں اوجھل ہو چکی تھی،

اور پل بھر میں ہی
میرے جاگتے تن پر
دھنک کی اتنی قوسیں بن چکی تھیں
آج جتنی بار مجھ کو دیکھ کر تو مسکرایا تھا!

بہت پیار سے
بعد مدت کے
جب سے کسی شخص نے چاند کہہ کر بلایا ہے،
تب سے
اندھیروں کی خوگر نگاہوں کو
ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے!

جمالِ ہم نشیں.....

ترے آئینۂ فن میں
سراپا دیکھ کر اپنا
بہت حیران ہوں
اور بارہا پلکیں جھپکتی ہوں کہ یہ میں ہوں
(کہ کوئی اور لڑکی ہے!)
مری آنکھوں میں پہلے بھی شرارت تھی
مگر اب تو ستارے کھلکھلاتے ہیں!
مرے لب اس سے پہلے بھی تبسم آشنا تھے

لیکن اب تو بے ضرورت مسکراتے ہیں!

غرور ایسا کہاں کا آ گیا دھیمے مزاجوں میں

کہ دن میں بھی اُڑی پھرتی ہوں خوابوں کی ہواؤں میں

مرے لہجے میں ایسی نرم فامی کب سے در آئی

کہ جس سے بات کرتی ہوں

سماعت پھول چنتی ہے

ہنسی میں اُس کھنک کی گونج ہے

جس سے محبت گیت بنتی ہے؛

اور ان سب سے سوا

دل کی گدازی،

جو مجھ کم ظرف کو شائستۂ ضبطِ الم کر دے

کٹے دشمن کی بھی اُنگلی تو میری آنکھ نم کر دے

سکھائے چشم پوشی

دوستی کا پردہ رکھے

بھلا

خلوصِ ہم وہاں کو شک کی آنکھوں سے ہمیشہ دیکھنا ہی ترک کروا دے
لہو کے اعترافِ عشق پہ ایمان لانے کی بصیرت دے،
مجھے گوتم کے ہر اُپدیش، عیسیٰ کے ہر اک سرمن کا بین السطر سمجھا دے!

میں اُس کی خوش گماں آنکھوں سے
دنیا دیکھتی ہوں،
مسکرا کر سوچتی ہوں،
زمیں یک لخت کتنی خوبصورت ہو گئی ہے!

کس شہر میں لائی خوش کلامی
دل بیشہ بی و رفیق شامی

اک عمر سے زندگی کا معمول
تنہائی ہے اور خود کلامی

دریا بھی جو میری رہگزر ہو
تقدیر سفر ہے تشنہ کامی

کچھ رستے ہیں عشق کے، جہاں پر
آتی نہیں کام تیز گامی

سب فیض اُسی تبفق نظر کا
کیا چیز ہے میری لالہ فامی

جو اپنے کمال کی جزا لے
کس کام کی ایسی نیک نامی

سب عشق کریں گے اور سچا
ہے اپنے قبیلے میں یہ خامی

جس جال کی رسیاں ہوں ڈھیلی
کیا سمجھے گا میری زیرِ دامی

ننھا سا پرند شاخِ گل پر
ہے ابرِ بہار کا پیامی

رنگوں کو تو چن دیا نظر میں
خوشبو کی زمام کس نے تھامی

جذبات ہی کند ہیں تو بے کار
تلوار کی لاکھ بے نیامی

آنکھوں سے رواں ہے جوئے خوں پر
پہلی سی نہیں سبک خرامی

یہ رسم تو میرؔ سے چلی ہے
دل والوں کو درد کی سلامی

ہم بے ہنروں کی زیست پل بھر
اقبال کی زندگی، دوامی

نئی آنکھ کا پُرانا خواب

آتش دان کے پاس
گلابی حدت کے ہالے میں سمٹ کر
تجھ سے باتیں کرتے ہُوئے
کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے
جیسے اوس میں بھیگی گھاس پہ
اُس کے بازو تھامے ہُوئے
میں پھر نیند میں چلنے لگی ہوں!

گونج

اُونچے پہاڑوں میں گم ہوتی پگڈنڈی پر
کھڑا ہُوا ننھا چرواہا
بکری کے بچے کو پھسلتے دیکھ کے
کچھ اس طرح ہنسا ہے
وادی کی ہر درز سے جھرنے پھُوٹ رہے ہیں!

حاکمِ بدہن

سرکار!

ہم تو آپ کے ایماں نثار تھے

ہر مقتلِ جفا میں لہو کے شریک تھے
کم پوشیِ قبا میں رفو کے شریک تھے
دل آپ کا دُکھا ہے تو آنسو ادھر بہے
چوٹ آپ کو لگی تھی مگر نیل کب پڑے
اپنی ہی سمت کھنچا ہُوا تیر ہم بھی تھے
اپنے خلاف لی ہُوئی تعزیر ہم بھی تھے

لیکن یہ سکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گردِ سفر تو ہیں

یہ کیا کیا کہ گردِ سفر بھی نہ اُٹھ سکے
چشمِ خطا سے بارِ نظر بھی نہ اُٹھ سکے

اب تک تو شہرِ جاں پہ عذاب آتے تھے مگر
اب کے تو اعتبار کی دنیا اجڑ گئی

ماتھے پہ بل نہ آنے دیا تھا کبھی پھر
لہجے میں اتنی گہری شکن کیسے پڑ گئی؟

بدن کے موسم بے اختیاری میں

کوئی دن زندگی میں ایسا آئے
تو میرے دھیان میں کھو کر
رموزِ شہریاری بھول جائے
میں اس شدت سے یاد آؤں
شکوہِ کج کلاہی بھول جائے
مرے بھی سارے رشتے، سارے ناتے
خود فراموشی بہا لے جائے
کل دنیا سمٹ کر تیری باہوں میں سما جائے

بدن کے موسمِ بے اختیاری میں

کسی پل —

فصیلِ شہر سے باہر

حصارِ چادر و دستار کی حد سے نکل کر

ایک لمحے کو — بس اک لمحے کو

ہم اپنے مقدر آزمائیں —

شبِ ممنوع سے اک پل چُرا لیں!

تاوان

گُلِ انار کی ہلکی گلابی چھاؤں میں بیٹھ کے
کافی بنانا
مجھے بھی اچھا لگتا ہے
لیکن ایسا کرتے ہُوئے
میری جھکی ہُوئی پلکیں
تجھ سے جو رنگ چھپاتی ہیں
وہ اس چھاؤں کے رنگ سے بڑھ کر گہرا ہے!

پذیرائی

ابھی میں نے دہلیز پہ پاؤں رکھا ہی تھا ۔۔۔ کہ
کسی نے مرے سر پہ پھولوں بھرا تھال اُلٹا دیا ۔۔۔
میرے بالوں پہ، آنکھوں پہ، پلکوں پہ، ہونٹوں پہ ،
ماتھے پہ ، رخسار پر
پھُول ہی پھُول تھے
دو بہت مسکراتے ہُوئے ہونٹ
میرے بدن پر محبت کی گلنار مُہروں کو یوں ثبت کرتے چلے جا رہے تھے
کہ جیسے ابد تک
مری ایک اک پور کا انتساب
اپنی زیبائی کے نام لے کر رہیں گے
مجھے اپنے اندر سمو کر رہیں گے

نیگ

صبحِ وصال کی پو پھٹتی ہے
چاروں اُور،
مدھ ماتی بھور کی نیلی ٹھنڈک پھیل رہی ہے
شگن کا پہلا پرند
منڈیر پر آکر
ابھی ابھی بیٹھا ہے
سبز کواڑوں کے پیچھے اک سرخ کلی مسکائی
پازیبوں کی گونج فضا میں لہرائی
کچے رنگوں کی ساری میں
گیلے بال چھپائے گوری
گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی!

بے پناہی

کسی اور کے بازوؤں میں سمٹ کر
تجھے سوچنا
کس قدر منفرد تجربہ تھا!
یہ احساس ہی کس قدر جان لیوا ہے جاناں!
کہ ایسی جگہ، اس خنک زار میں
میرے تن پہ پھسلتی ہوئی شبنمی حدّتیں
تیری لذت فشاں انگلیوں سے اگر پھوٹتیں
تو مرے جسم کی ایک اک پور تب کس طرح جگمگاتی
ترے روشنی آشنا ہاتھ
کیسے بھٹکتے،

یہاں

اب یہاں

اور اب سرخوشی کی اُس اک آخری یاد رہ جانے والی گھڑی میں...

وقت کی ناسمجھ رَو ہے

اور بے بسی کی نئی لہر ہے،

زمستاں کی اس آخری شام میں

اور مرے جسم میں

شاید اب کوئی بھی فرق باقی نہیں،

میرا ساتھی مری بند آنکھوں کو کس پیار سے چوم کر کہہ رہا ہے:

ارے — آج تو برف باری ابھی سے ہی ہونے لگی

جان! — آؤ مجھے اوڑھ لو!

اُسے کیا خبر ہے

کہ اس وقت مَیں آگ بھی اوڑھ لوں تو

مری رُوح پر ہونے والی کوئی برفباری

نہیں رُک سکے گی!

شامِ غریباں

غنیم کی سرحدوں کے اندر
زمینِ نامہرباں پہ جنگل کے پاس ہی
شام پڑ چکی ہے
ہواؤں میں کچے گلاب جلنے کی کیفیت ہے
اور ان شگوفوں کی سبز خوشبو
جو اپنی نوخیزیوں کی پہلی رُتوں میں
رعنائیِ صلیبِ خزاں بنے
اور بہار کی جاگتی علامت ہوئے ابد تک!
جلے ہوئے راکھ خیموں سے کچھ کھلے ہوئے سر
ردائے عفت اُڑھانے والے بریدہ بازو کو ڈھونڈتے ہیں
بریدہ بازو — کہ جن کا مشکیزہ

ننھے حلقوم تک اگرچہ پہنچ نہ پایا
مگر وفا کی سبیل بن کر فصیلِ سے اب تک چھلک رہا ہے

برہنہ سر بیبیاں
ہواؤں میں سُوکھے پتّوں کی سرسراہٹ پہ
چونک اُٹھتی ہیں
بادِ صرصر کے ہاتھ سے بچنے والے پھُولوں کو چُومتی ہیں
چھپانے لگتی ہیں اپنے اندر
بدلتے، سفّاک موسموں کی اداشناسی نے
چشمِ حیرت کو سہم ناکی کا مستقل رنگ دے دیا ہے،
نگاہِ تخیئل دیکھتی ہے
چمکتے نیزوں پہ سارے پیاروں کے سر سجے ہیں،
کٹے ہُوئے سر
شکستہ خوابوں سے کیسا پیمان لے رہے ہیں
کہ خالی آنکھوں میں روشنی آتی جا رہی ہے!

ادرکنی

خیمۂ بے گناہی سے میں
شہرِ انصاف کی سمت جونہی بڑھی،
اپنی اپنی کمیں گاہ سے
میرے قاتل بھی نکلے
کمانیں کسے، تیر جوڑے، طمنچے چڑھائے،
مچانوں پہ ناوک بدستوں کو تیار رہنے کے احکام دیتے ہوئے،
شاہراہوں پہ پیاسی سنانیں لیے فتنہ گر صف بہ صف
چوک پر قاضیٔ شہر خنجر بکف
راستے دشنہ در آستیں
گھات میں شہر کا ہر مکیں
میرے تنہا لبادے کی آہٹ کو سنتے ہوئے
عنکبوتی ہنر میرے چاروں طرف جال بنتے ہوئے

کوئی میرے علم کا طلبگار
کوئی مرے سر کا خواہاں
تو کوئی ردا کا تمنائی بن کر
جھپٹنے کو ہے:
حلقۂ دشمناں تنگ ہونے کو ہے
موت سے آخری جنگ ہونے کو ہے
کوزۂ عشق میں
میری بے چارگی
اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہُوئے
ہاتھ باندھے ہُوئے
سر جھکائے ہُوئے
زیرِ لب ایک ہی اسم پڑھتی ہُوئی ــــ
یا غفور الرحیم
یا غفور الرحیم

تقیہ

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں،
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سنا ہے باطل قرار پائے،
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف ہوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی
بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
روح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں!

خموشی و مصلحت پسندی میں خیریت ہے
مگر مرے شہرِ منحرف میں
ابھی کچھ ایسے غیور و صادق بقیدِ جاں ہیں
کہ حرفِ انکار جن کی قیمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غلام زادے
انھیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ سردیتّھر میں چُننے دینا
کہ آج سے جب،
ہزار ہا سال بعد ہم بھی،
کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہڑپہ بن کر تلاشے جائیں
تو اُس زمانے کے لوگ
ہم کو
کہیں بہت کم نسب نہ جانیں!

گنگا سے

جُگ بیتے

دجلہ سے اک بھٹکی ہُوئی لہر

جب تیرے پوتر چرنوں کو چھُونے آئی تو

تیری ممتا نے اپنی باہیں پھیلا دیں

اور تیرے ہرے کناروں پر تب

اناس اور کٹھل کے جھنڈ ہیں گھرے ہُوئے

کھپریلوں والے گھروں کے آنگن میں کلکاریاں گونجیں

میرے پرکھوں کی کھیتی شاداب ہُوئی

اور شگن کے تیل نے دیے کی لَو کو اونچا کیا
پھر دیکھتے دیکھتے
پیلے پھولوں اور سنہری دیوں کی جوت
ترے پھولوں والے پُل کی قوس سے ہوتی ہوئی
مہران کی اور تک پہنچ گئی،
میں اُسی جوت کی ننھی کرن
پھولوں کا تھال لیے تیرے قدموں میں پھر آ بیٹھی ہوں
اور تجھ سے اب بس ایک دیا کی طالب ہوں
یوں انت سمے تک تیری جوانی ہنستی رہے،
پر یہ شاداب ہنسی
کبھی تیرے کناروں کے لب سے
اتنی نہ چھلک جائے
کہ میری بستیاں ڈوبنے لگ جائیں
گنگا پیاری!

یہ جان

کہ میرے روپہلے راوی اور بھورے مہران کی گیلی مٹی ہیں

مری ماں کی جان چھپی ہے

مری ماں کی جان نہ لینا

مجھ سے مرا مان نہ لینا

تاج محل

سنگِ مرمر کی خنک باہوں میں
حسنِ خوابیدہ کے آگے مری آنکھیں شل ہیں
گنگ صدیوں کے تناظر میں کوئی بولتا ہے
وقت جذبے کے ترازو پہ زر و سیم و جواہر کی تڑپ تولتا ہے!
ہر نئے چاند پہ پتھر وہی سچ کہتے ہیں
اُسی لمحے سے دمک اُٹھتے ہیں ان کے چہرے
جس کی لَو، عمر گئے، اک دلِ شب زاد کو مہتاب بنا آئی تھی
اُسی مہتاب کی اک نرم کرن

سانچۂ سنگ میں ڈھل پائی تو

عشق رنگِ ابدیت سے سرافراز ہُوا

کیا عجب نیند ہے

جس کو چھُو کر

جو بھی آتا ہے کھُلی آنکھ لیے آتا ہے

سو چکے خوابِ ابد دیکھنے والے کب کے

اور زمانہ ہے کہ اس خواب کی تعبیر لیے جاگ رہا ہے

اب تک۔

اے جگ کے رنگ ریز

اے جگ کے رنگ ریز!
مری بھی اوڑھنی رنگ دے
میں پنگھٹ پر کیسے جاؤں
بھیگے پلو سے ہاتھوں کو بچاتی سکھیاں
مجھ پر ہنستی ہیں!
میں نے سو سو جتن کیے
پر مجھ پر رُوپ نہ آیا
کیسر منگھڑی، حنا کے پتّے، ہار سنگھار کا ڈنٹھل
اور کُسم کے پھول

سب آنچل میں بندھے رہ گئے

کوئی مرے کام نہ آیا

گہنے پاتے گئے اکارت

پتی کا پیار بھی مری کایا بدل نہ پایا

رہی مری چُنری پھیکی کی پھیکی !

ہاں — بس اک رُت ایسی آئی تھی

جب مجھ پر ہریالی ٹوٹ کے چھائی تھی

تن کے سندر بن میں ساتوں رنگ کے پھول کھِل اُٹھے تھے !

لیکن پہلی ہی بارش میں

جل گئے سارے پھول

ایک ذرا سی دھوپ ہُوئی

اور پل بھر میں سب دُھول

دھوپ کڑی تھی یا پھر رنگ ہی کچّے تھے —

اب تک جان نہ پائی !

بس اتنا بھر دیکھ سکی ہوں

اے جگ کے رنگ ریز!

تری مٹھی میں دھنک ہے

بادل، جل، آکاش، چندرما، کمل، چنبیلی، دُوب

اُودا، اُجلا، نیلا، پیلا، سرخ، رو پہلا، سبز

اتنے سارے رنگوں میں

مرے نام کا کوئی رنگ تو ہو گا

خسرو مرشد!

اپنے ہاتھ سے میرے تن پر مل دے

اور جو تجھے یہ بھی نہ سہائے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ لے!

تو برمن بلا شدی

کچے ذہن اور کچی عمر کی لڑکیاں

اپنی خوبی ہیں

مائع جیسی ہوتی ہیں

جس برتن میں ڈالی جائیں

اُسی شکل میں کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں!

کیسا چھلکنا، کیسا اُبلنا اور کہاں کا اُڑنا!

اور اک میں ہوں — پتھر اور شوریدہ مزاج!

کاسۂ خالی ہیں بے وجہ سما جانے کی بجائے

اُس سے اس قوت سے ٹکرانا چاہوں کہ

ظرفِ تہی کی گونج سے اُس کا بھرم کھُل جائے!

میں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے !
ہاں — گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں ؛
لیکن جب بھی مجھکو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے تو
کنگن بچھو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں !
بہت ہی میٹھے بولوں کا جزوِ اعظم
جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آ جاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
مجھ کو ساری عمر بسر کرنی ہے !

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے
میں نے اپنا ہاتھ اچانک کسی اور کے ہاتھ میں پایا

لیکن جلد ہی، میری ضرورت سے زاید بے رحم بصارت نے یہ دیکھ لیا ہے

یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے

یا پھر مٹی پر

اُس کے پنجے اُس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں

انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہوئی جاتی ہے!

شام کے ڈھل جانے کے بعد

جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں

میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہوں

اور اپنی چادر پر تازہ دھبے بنتے دیکھتی ہوں

کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا

نہیں آتی

میں ___ آقائے ولی نعمت کو

خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں!

کنیادان

بال صندل کے پانی میں بھیگے ہوئے
جسم چندن کے مس سے دمکتا ہُوا
آنکھ خوابوں کی افشاں سے بوجھل بہت
ہونٹ پر ان کہی کا مزہ!
گوری گوری کلائی سے لپٹی ہُوئی موتیے کی لڑی
سرخ زرتار جوڑے میں سمٹی ہوئی ایک کچّی کلی
گاہے گاہے جھلکتی ہُوئی موہنی شکل وہ — چاندسی
چوڑیوں کی کھنک
اور پائل کی چھن چھن سے چھنتی ہُوئی
کیسی پیاری ہنسی
رُتس پہ سکھیوں کی وہ چھیڑ کہ
آئینے سے بھی نظریں ملائی نہیں جاسکیں!

شامیانے کے پرلی طرف،
وقت کے جبر کے سامنے،
چپ کھڑی مامتا —
جس کے چاروں طرف
تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن گیر
غرّاہٹوں کا عجب غول ہے

اور اسی غول سے
اپنی نازوں کی پالی کی خاطر
بڑے صبر سے
ایک مجبور رہزنی کی صورت وہ چُن لائی ہے
اک ذرا کم ضرر بھیڑیا!

آتشِ جاں سے قفس آپ ہی جل جانا تھا
قفلِ زنداں! ترا مقسوم پگھل جانا تھا

جس کو اک نسل نے سینچا تھا لہو سے اپنے
آل نہ اک روز تو اس پیڑ کو پھل جانا تھا

وقت سے پہلے کبھی شام نہ یوں آ لیتی
منہ اندھیرے ہی ہمیں گھر سے نکل جانا تھا

ہارنے والوں سے سمجھوتا کہاں ممکن تھا
حرف ملتے بھی تو مفہوم بدل جانا تھا

کس کو ٹھہرائیں گے میثاقِ محبت میں فریق
ہم نے خود کو بھی اُبا دے کا اٹل جانا تھا

اس نے ہی پہلی ہوا میں مرا دامن تھاما
جس دیے کو کسی نیکی کا بدل جانا تھا

وقت کی اتنی کمیں گاہوں سے ہو آئی ہے
زندگی! اب تو کسی طور سنبھل جانا تھا

وہ تو کہیے کہ کھلی آنکھ رکھی نیند میں بھی
ورنہ ہم شب کا کوئی وار تو چل جانا تھا

فصل بر وقت نہ کٹتی جو بسروں کی پروین
آسمانوں نے زمینوں کو نگل جانا تھا

کسے خبر ہے کہ کیا رنج و غم اُٹھاتے ہیں
تراش کر جو زباں کو قلم اُٹھاتے ہیں

قرار دادِ محبت تو کب کی فسخ ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اُٹھاتے ہیں

زمیں کی پشت تحمل سے دوہری ہو جائے
اگر وہ بوجھ اُٹھائے جو ہم اُٹھاتے ہیں

مثالِ ذرّۂ دُردِ تہِ جام ہیں کہ بیٹھ کے بھی
اِک اور حشر بسِ جام ہم اُٹھاتے ہیں

ہمیں بجھانے کو اندر کا حبس کافی ہے
ہوا مزاجوں کا احسان کم اُٹھاتے ہیں

وہاں بھی ہم تو ستارہ سوار تھے کہ جہاں
بہت ہی سوچ سمجھ کے قدم اُٹھاتے ہیں

پوسٹ ڈنر آئیٹم

آپ کی زلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے
آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے
کہ آج آپ نے
اتنی انواع و اقسام کی لذتیں میز پر جمع کر دیں
کہ ہم لوگ حیران تھے سب
کہاں سے شروعات ہوں
تعجب تو یہ ہے کہ اپنے سماجی فرائض میں اس درجہ مصروف
رہنے کے باوصف
آپ اتنے گھنٹے کچن میں رہیں

نوکروں کا ہے قحط اور پھر خاص کر ٹکس کی بد دماغی کے عالم میں
اتنا بہت کچھ! پھر اتنا مزیدار کھانا پکانا!
ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا
اس پہ حیران کن بات یہ ہے
کہ اتنی تھکن پر
جبیں اور ساری پہ کوئی شکن تک نہیں
اس ڈنر کے مقابل میں بیگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا!

شکریہ
اس پسندیدگی کا بہت شکریہ
اب یہ فرمایئں، کیا پیش ہو
چائے، کافی کہ شاعر؟

رنگ نیم

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو —!
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں۔
جو پہنا دو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں

سوتی جاگتی آنکھیں میری

جب چاہے بینائی لے لو

کوک بھرو اور باتیں سُن لو

یا میری گویائی لے لو

مانگ بھرو، سیندور لگاؤ

پیار کرو، آنکھوں میں بساؤ

اور پھر جب دل بھر جائے تو

دل سے اُٹھا کے طاق پہ رکھ دو

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو

ٹھیک ہی کہتے ہو!

بوئے یاسمن باقیست

(نذرِ فراق)

سبز دنوں کا سب سے تناور پیڑ
ہوا کے آگے اب بے بس ہے
پتّے اک اک کر کے گرتے جاتے ہیں
وہی شاخ کہ کبھی دلہن کی طرح پھولوں سے لد کر بھی
کیسی تیکھی سرشاری سے تنی رہتی تھی
آج اپنے سب گہنے اُتار چکی ہے — پھر بھی خمیدہ ہے
وہی تنا — جو برف کے ہر موسم کے بعد
ننھی ننھی ہری، ستاروں جیسی کونپلوں سے بھر جاتا تھا،
آج اُس پر بس چیونٹیاں چلتی نظر آتی ہیں،
وہی شگوفے جن سے لپٹ کر دھوپ کبھی ہنستی،

تو رنگوں اور کرنوں کے چہرے گڈمڈ ہو جاتے،
اُس کی بھی ساری پنکھڑیاں رزقِ ہوا کہلائیں
سبز دنوں کا سب سے تنآور پیڑ — آخر
اپنی ہر ممکن ہریالی کما چکا
اور اب خاموشی سے اپنے ہونے کی مجبوری کا،
وعدہ معاف گواہ بنا استادہ ہے
اور وقت کی اٹل شہادت پر،
اپنے فیصلہ کن لمحے کا رستہ دیکھ رہا ہے
تنہا — اور تہی داماں!
سبز لباسی گئے جنم کی بات ہوئی
پھر یہ برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر،
اتنی ٹھنڈی چھاؤں کہاں سے آتی ہے،
بن پھولوں کے
خوشبو کیسے پھیل رہی ہے؟

ملالِ تیز روی

کتنا عجب ہے یہ راگ ملن کا
کوئی بھی سُر تو نہیں کومل
ایسی شور مچاتی ہوائیں
کیسے کِھلے تن کی کونپل
اور ہردے کی وہ آنکھ
جو موہ کی رُت میں شریر سے پہلے جاگا کرتی ہے
وقت کے اتنے تیز بہاؤ میں
تجھ سے ملن کی رُت کچھ ایسے گزرتی ہے

جیسے گھنے جنگل میں سرپٹ دوڑتی ریل کی کھڑکی سے

ہاتھ بڑھا کر

کسی گھنیری شاخ کو تھامنا چاہوں

اور اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ

ایک خراش بسا لوں

اک انکار کی نیلی لکیر کا

اور اضافہ کر لوں !

اک سُورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اُٹھا
آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اُٹھا

کس سے پُوچھوں ترے آقا کا پتہ اے رہوار
یہ علَم وہ ہے نہ اب تک کسی شانے سے اُٹھا

حلقۂ خواب کو ہی گردِ گُلو کس ڈالا
دستِ قاتل کا بھی احسان نہ دِوانے سے اُٹھا

پھر کوئی عکس شعاعوں سے نہ بننے پایا
کیسا مہتاب مرے آئینہ خانے سے اُٹھا

کیا لکھا تھا سرِ محضر جسے پہچانتے ہی
پاس بیٹھا ہُوا ہر دوست بہانے سے اُٹھا

آج تک شہر کا چہرہ نہیں دُھلنے پایا
گرد کا کیسا بگولا ترے جانے سے اُٹھا

زندگی میں یہ بدن شعلۂ جوّالہ تھا
موجۂ سرد! مری راکھ ٹھکانے سے اُٹھا

ڈھال اب وقت کے ہاتھوں میں ہے اے تیرانداز
رکھ دے اِک سمت کماں، ہاتھ نشانے سے اُٹھا

دل تری چشمِ مدارات سے بیعت تھا تو پھر
کس طرح بزم میں اوروں کے اٹھانے سے اُٹھا

دُودِ یک سینۂ سوزاں سے بھلا کیا ڈرنا
وہ دُھواں دیکھ جو شعلوں کے بجھانے سے اُٹھا

دِل دُکھا ہے تو کُھلی ہے مرے وجدان کی آنکھ
اِک شگوفہ تھا کہ شبنم کے جگانے سے اُٹھا

سونپ دے اپنا ہُنر اُن کو کہ جن کا حق ہے
وقت آیا ہے کہ اب سانپ خزانے سے اُٹھا

یہاں وہ لڑکی سو رہی ہے

کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب مول لے کر

وصال کی عمر رتجگے میں گزار دی تھی

عجیب تھا انتظار اس کا

کہ جس نے تقدیر کے تنک حوصلہ مہاجن کے ہاتھ

بس اک، دریچۂ نیم باز کے سُکھ پہ

شہر کا شہر رہن کروا دیا تھا

لیکن وہ ایک تارہ

کہ جس کی کرنوں کے مان پر

چاند سے حریفانہ کشمکش تھی

جب اُس کے ماتھے پہ کھلنے والا ہو

تو اُس پل

سپیدۂ صبح بھی نمودار ہو چکا تھا

فراق کا لمحہ آ چکا تھا!